

ڈاکٹر محمد حمید اللہ: مشاہدات و تاثرات

ظفر الحاق انصاری ☆

ترجمہ: خورشید احمد ندیم ☆☆

اس واقعے کو بیتے اٹھارہ بس ہو چکے ہیں۔ ایک سہر میں اپنے ایک عزیز، محترم دوست اور معروف سعودی اسکالر جناب اسماعیل ابراہیم نواب کے ساتھ پیرس میں ایک فلیٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ یہ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی اقامت گاہ تھی۔ گھنٹی بجی اور چند لمحے بعد گھر میں ایک بلب روشن ہو گیا۔ چند لمحے بعد ڈاکٹر حمید اللہ دروازے پر نمودار ہوئے۔ اس موقع پر ان سے جو گفتگو ہوئی، اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا لیکن اس دوران انہوں نے ایک ایسا جملہ کہا، جس کو میں ابتدا میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک اسے ان کے کسی بھی تذکرے کا مقدمہ ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب کو انہی دنوں حکومت پاکستان نے دل لاکھ روپے کا ایک ایوارڈ دیا تھا، جو سیرت پاک پر ان کی علمی خدمات کا اعتراف تھا۔ انہوں نے یہ پوری رقم ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے نذر کر دی۔ میں نے اس خبر کی تصدیق چاہی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ”آپ نے صحیح سنًا۔ پھر کچھ تو قف کے بعد وہ گویا ہوئے ”اگر میں یہاں لے لیتا تو پھر وہاں کیا ملتا؟“۔

اٹھارہ بس کے بعد بھی یہ جملہ میری سامعت کے لیے تروتازہ ہے اور اس کی تازگی میں شاید کبھی فرق نہ آئے۔ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کون تھے، کیسے تھے!

ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کے ساتھ برسوں پر محیط یادوں کا جب میں احاطہ کرتا ہوں تو یہ سلسلہ ۱۹۳۸ء کے موسم گرما سے جا ملتا ہے جب میں پہلی مرتبہ ان سے براہ راست متعارف ہوا تھا۔ قیام پاکستان کو ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا۔ یہ مملکت چونکہ اسلام کے نام پر وجود میں آئی تھی، اس لیے بعض اصحاب کی ترجیحات میں ان اصولوں اور خصوصیات کا تعین سرفہرست تھا جو ایک نومولود اسلامی ریاست کے لیے نظریاتی بنیادیں فراہم کر سکیں۔ اس ضمن میں تین اصحاب مولانا شبیر احمد عثمنی (م ۱۹۳۹ء)، مولانا احتشام الحق تھانوی (م ۱۹۸۰ء) اور میرے والد محترم محمد ظفر احمد انصاری (م ۱۹۹۱ء) نے ابتدائی

قدم اٹھایا اور اس مسئلے پر غور و فکر کے لیے بعض اصحاب علم و فضل کو کراچی میں جمع کیا۔ میری یادوادشت کے مطابق جن حضرات نے اس دعوت کو قبول کیا وہ تھے مولانا مناظر احسن گیلانی (م ۱۹۵۶ء)، ڈاکٹر محمد حمید اللہ (م ۲۰۰۲ء)، اور ایک نبتاب کم معروف شخصیت جناب غلام دیگیر رشید۔ موفر الدکر ”اسلامی تہذیب کیا ہے؟“ کے مرتب تھے جو ان دونوں خاصی مقبول تھی۔ ان تینوں شخصیات کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا۔ میرے ذہن میں ان تین حضرات ہی کے نام محفوظ تھے، برادرم ڈاکٹر محمود احمد غازی اور ڈاکٹر محمد الغزالی نے اس فہرست میں ایک اور صاحب علم کا اضافہ کیا ہے۔ یہ بھارت سے تشریف لانے والے مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی تھے۔ یہ حضرات اپریل ۱۹۷۸ء میں کراچی میں جمع ہوئے۔

میری معلومات کی حد تک، اس منصوبے کے اخراجات، جنوبی افریقہ میں آباد میاں خاندان نے اٹھائے جو متمول بھی تھے اور اسلامی کاموں میں بہت پر جوش اور سرگرم بھی۔ سورت (بھارت) سے تعلق رکھنے والے اس تاجر خاندان نے، جو جنوبی افریقہ میں اپنا کاروبار مستحکم کر چکا تھا، ان دونوں کراچی میں کاروباری وسعت کے امکانات ملاش کر رہا تھا۔ کم و بیش چھ سال افراد کے اس گروپ نے تقریباً دو ہفتوں تک اپنی مشاورت جاری رکھی۔ میری ویدر ثاور کے سامنے ایک بڑا فلیٹ، جسے میاں فیملی نے کچھ ہی پہلے خریدا تھا ان سرگرمیوں کا مرکز تھا، یہ جگہ اسی خاندان کی قائم کردہ شاندار مجلس علمی لا جبریری کے لیے برسوں زیر استعمال رہی۔

مجھ جیسے کسی نو عمر کے لیے تو اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ وہ ان مجالس میں شریک ہوتا یا یہ جان پاتا کہ کیا باقیں زیریخت ہیں، تاہم کبھی کبھی گفتگو کا کوئی حصہ یا کسی کا تبصرہ ساعت سے مکرا جاتا۔ اس اجتماع کے ایک منتظم کے بیٹھ کی حیثیت سے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے میں اس مجلس میں آتا جاتا رہتا تھا۔ یہ بات بھی میرے لیے کچھ کم باعث فخر نہ تھی کہ اس طرح میں ان عظیم المرتبت شخصیات کی چند جھلکیاں اپنے دل و نگاہ میں محفوظ کر سکا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس موقع پر مولانا مناظر احسن گیلانی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ ایک عالم کی حیثیت سے ان کا جو مقام و مرتبہ تھا وہ کے نہیں معلوم، اس کے علاوہ مجھے ان کی شخصیت میں سادگی، وقار اور حس مزاج کا ایک بڑا دل کش امتزاج نظر آیا۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے تواضع، انسار اور عاجزی طبع نے بھی مجھ پر گہرا اثر چھوڑا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب ایک ابھرتے ہوئے اسکالر کے طور پر برصغیر میں متعارف ہو رہے تھے۔ میں اپنے والد صاحب کے پاس ان کی تصنیف The Muslim Conduct of State دیکھ چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس زمانے میں اس کتاب کو پڑھنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ

جان کر کے فتنی اور علمی اعتبار سے یہ میرے معیار فہم سے بلند ہے، ایک بھاری پھر سمجھ کر اسے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ تاہم کتاب کے محققانہ انداز نے میرے ذہن پر گہرا نقش چھوڑا۔ چند سال بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کتاب ٹھوس تحقیق پر بنی ہے اور اس سے ایک اہم علمی میدان - اسلامی میں الاقوای قانون - میں نئے اقتدار سامنے آتے ہیں۔

یہ مجلس جن کا میں نے ذکر کیا، وہ بارہ دن سے زیادہ جاری نہ رہ سکیں۔ میں یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیوں ختم ہو گئیں۔ شاید اس کا سبب حیدر آباد پر منڈلانے والے وہ خطرات تھے جن کے باعث سرحد پار سے آئے ہوئے شرکاء واپس جانے پر مجبور ہوئے، اب یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ حیدر آباد دکن کی ریاست چند ماہ بعد ہی ہندوستان کی توسعی پسندی کا شکار ہو گئی۔

ان مجلس کے انعقاد کے سلسلے میں میرے علم کی حد تک اخبارات میں کوئی خبر شائع نہیں ہوئی اور میرا گمان ہے کہ یہ بات دانتہ تھی۔ اس کا غالباً ایک بڑا سبب یہ تھا کہ جن لوگوں نے اس کام کا پیڑھہ اٹھایا تھا، وہ ٹھوس علمی و فکری نتائج کے متمنی تھے ان کے پیش نظر اس سے کوئی سیاسی فائدہ اٹھانا نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس بات کا اخبارات میں چھپنا ان مہماں کے لیے پریشانی کا باعث ہو سکتا تھا اس لئے ہندوستان کا پریس اس بات کو اچھا سکتا تھا کہ یہ حضرات پاکستان میں ایک اسلامی ریاست کے قیام میں عملی معاونت کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج یہ بات شاید ہی کسی کے علم میں ہو کہ اس نوعیت کی کوئی کاوش بھی ہوئی بھی تھی۔

ان مجلس کی کوئی رپورٹ یا سفارشات تو سامنے نہ آسکیں لیکن اس کے باوجود یہ کوشش فائدے سے خالی نہ تھی۔ پاکستان کی اسلامی تشكیل کی مہم میں مصروف حضرات کو متعلقہ امور میں غور و فکر اور تبادلہ خیال، ان کی حقیقت پسندی میں اضافہ کا موجب ثابت ہوئے ہوں گے اور انہیں اس بات کا اندازہ ہوا ہوگا کہ میسوں صدی میں اسلامی ریاست کی تشكیل کے لئے یہ بات کافی نہیں کہ امویوں، عباسیوں یا عثمانیوں کے قائم کردہ ریاستی اداروں کی کورانہ خوش چینی کرتے ہوئے انہیں من و عن نافذ کر دیا جائے۔ بلکہ یہ کام تحقیقی اور اجتہادی بصیرت کا مقاضی ہے۔ اس ابتدائی کاوش کا یہ نتیجہ تو سامنے نہیں آیا کہ یہ حضرات اسلامی ریاست کی تشكیل کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کے جوابات سامنے لا سکے ہوں لیکن یہ ضرور ہوا کہ وہ سوالات نکھر کر سامنے آگئے جو اس مقصد کے لیے بہر طور جواب طلب تھے۔ یہ بات بعد از قیاس نہیں کہ یہ ابتدائی کاوش بعد میں بورڈ تعلیمات اسلامیہ کے کام میں مدد ثابت ہوئی ہو جو ۱۹۳۹ء میں قائم ہوا۔ اس بات کا بھی توی امکان ہے کہ اسلامی ریاست

کے ان ۲۲ بنیادی نکات کے تعین میں اس نے کوئی کروار ادا کیا ہو جو ۱۹۵۱ء میں تمام مکاتب فکر کے اکتیس علماء نے مشقہ طور پر منظور کیے۔ ان نکات پر اتفاق رائے اسلامی ریاست کی تشكیل کی طرف بلاشبہ ایک غیر معمولی پیش رفت تھی۔

ان مجالس کے چند ہی ماہ بعد ڈاکٹر حمید اللہ کا ذکر اس وقت ایک بار پھر سننے میں آیا جب حیدر آباد کے آزادانہ تشخص کو درپیش خطرات مزید ابھر کر سامنے آئے۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آباد کے سرکاری وفد کے ایک رکن مقرر ہوئے ہیں جو براستہ کراچی، غیر ملکی دورے پر جا رہا ہے۔ اس وفد کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ عالمی رائے عامہ کو بھارت کی امکانی جارحیت کے خلاف بیدار کرے اور آزادی سے محبت رکھنے والی اقوام کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ حیدر آباد پر قبضے کے سوچے سمجھے بھارتی منصوبے کے خلاف آواز اٹھائیں۔ میرا اندازہ ہے کہ کراچی کے اجلاس میں شرکت کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ واپس حیدر آباد چلے گئے اور چند ماہ کے بعد پھر کراچی واپس آکر پیروی ممالک کے دورے پر روانہ ہو گئے۔



۱۹۵۰-۱۹۵۹ء میں جب ڈاکٹر حمید اللہ نے ایک سال کراچی میں قیام فرمایا تو مجھے ان سے ملنے جلنے کے متعدد موقعے ملے۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۳۹ء میں بورڈ تعلیمات اسلامیہ کے ممبر کی حیثیت سے کراچی تشریف لائے تھے۔ یہ بورڈ حکومت پاکستان نے تشكیل دیا تھا اور اس کا کام اسلامی آئین کی تشكیل میں دستور ساز اسمبلی کی معاونت کرنا تھا۔ اس بار وہ پیرس سے تشریف لائے تھے۔ پیرس میں وہ تیس کی دہائی میں بھی اپنے دور طالب علمی میں کئی سال تک قیام کر چکے تھے۔ ستمبر ۱۹۳۸ء میں جب بھارت نے حیدر آباد کو اپنا حصہ بنا لیا تو اس وقت ڈاکٹر صاحب پیرس میں ہی تھے اور انہوں نے پیرس میں ہی قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

بورڈ تعلیمات اسلامیہ مندرجہ ذیل شخصیات پر مشتمل تھا۔

۱۔ علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) چیریئن

۲۔ مولانا مفتی محمد شفیع (م ۱۹۷۶ء)

۳۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ

۴۔ پروفیسر محمد عبدالغافل

۵۔ مفتی جعفر حسین مجتہد (م ۱۹۸۳ء)

۶۔ میرے والد، محمد ظفر احمد انصاری بورڈ کے سیکرٹری تھے۔

ہم ان دنوں کراچی کے ایک معروف مقام سعید منزل کے سامنے رہتے تھے۔ یہ بندر روڈ پر ایک دو منزلہ عمارت کا ایک فلیٹ تھا جس کا نمبر ۱۲/۱۸ تھا۔ یہ سڑک اب ایم اے جناح روڈ کہلاتی ہے۔ گھر سے دستور ساز اسمبلی کی عمارت تک، جہاں بورڈ کا دفتر واقع تھا وہ بارہ منٹ کا پیدل راستہ تھا۔ میں اپنے والد سے ملنے وقت فوتا وہاں جایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا اکابر، ان کا فطری تواضع، ان کی ایسی خوبیاں تھیں کہ ان سے ملنے جانے والوں کے لئے ان سے بے خبر رہنا ممکن نہ تھا بلکہ ان کی یہ خوبیاں ان سے متعارف ہونے والوں کو ان کا گرویدہ بنا لیتی تھیں۔ تاہم میرا ان سے رابطہ بڑی حد تک سلام دعا تک محدود رہا۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا اور شاید اتنی خود اعتمادی مجھ میں نہ تھی کہ میں ان سے کسی اہم علمی مسئلے پر گفتگو کی جسارت کرتا۔ جہاں تک ڈاکٹر حمید اللہ کا تعلق ہے تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی فطرتاً ایک کم گو انسان ہیں اور لوگوں کے ساتھ اختلاط کے معاملے میں کسی پیش قدمی کا میلان نہیں رکھتے۔ چنانچہ میں نے انہیں بہت کم گفتگو کرتے دیکھا والا یہ کہ ان سے کوئی سوال کرے۔ تاہم جب بھی انہوں نے گفتگو کی، میں ان کی نپی تی، ذمہ دارانہ اور متواضع گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ ان کی نزی طبع اور شاشگی ان پر مستزاد تھے۔ ان کی یہ سادہ طبعی مجھ پر اس وقت پوری طرح واضح ہوئی جب ایک سوال کے جواب میں انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ خداداد کالوں سے بورڈ تعلیمات اسلامیہ کے دفتر تک روزانہ پیدل چل کر آتے ہیں۔ وہ اس کالوں میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کالوں سے بورڈ کے دفتر تک کا فاصلہ تقریباً تین میل ہوگا۔

ان دنوں میں اسلامیہ کالج کراچی کا طالب علم تھا۔ ۱۹۳۹ء کے پہلے ٹرم میں ڈاکٹر صاحب ہمارے کالج تشریف لائے اور انہوں نے ”اسلامی بین الاقوامی قانون“ کے موضوع پر یکچھ دیا۔ ان کے پاس تحریری نوٹس نہیں تھے، اس کے باوجود ان کا یکچھ بہت منضبط، منظم، معلومات افزدا اور فکر انگیز تھا۔ تاہم ان کا لجہ مدھم تھا اور یکچھ کے دوران انہوں نے شاید ہی حاضرین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں دیکھا ہو۔ ہر اعتبار سے یہ ایک نہایت عمدہ یکچھ تھا جو ہر طرح کے تصنی، اداکاری اور سطحی خطابت سے پاک تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اس یکچھ میں بھرپور دلائل کے ساتھ یہ بات کہی کہ بین الاقوامی قانون دراصل مسلمان فقیہاء کی علمی و فکری کاوش کا نتیجہ ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے ڈاکٹر صاحب نے اس یکچھ میں بین الاقوامی قانون کے لیے international law کے بجائے ڈاکٹر صاحب نے اس یکچھ میں بین الاقوامی قانون کے لیے inter-statal law کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ بین الاقوامی قانون کے اصولوں کی تکمیل کے سلسلے

میں بطور بانی، امام محمد ابن الحسن الشیعی (م ۸۰۵ء) کا نام ۱۹۳۹ء کی خداں کے آخری دنوں سے میرے ذہن پر نقش ہے جب میں نے ڈاکٹر صاحب کا یہ لیکچر سنایا تھا۔

بطور رکن بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ، کراچی میں ایک سال گزارنے کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ والپس پیرس چلے گئے۔ ان کی روائی پر ان کے احباب رنجیدہ اور کبیدہ خاطر تھے۔ اس بات نے ہمیں مزید اداس کر دیا کہ وہ یہاں کچھ خوش نہ تھے، اور ان کی واپسی کا ایک سبب ان کی بے اطمینانی تھی۔ شاید وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ بورڈ کا کام کما حقہ نتیجہ خیز نہیں ہے۔ شاید پیرس کی شاندار لابورریوں اور اپنے اصل کام، درس و تدریس اور تحقیق، سے دوری انہیں گراں گزرنے لگی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا مزاج ایک ایسے ماحول میں کام کرنے پر آمادہ نہ ہو جہاں یہ بات پوری طرح واضح نہ ہو کہ ہر متعلقہ شخص کی ذمہ داری کیا ہوگی؟ شاید وہ پاکستان کے ارباب حل و عقد کے بارے میں کوئی ہتنی تحفظ رکھتے ہوں، یا شاید وہ یہ بھی خیال کرتے ہوں کہ وستور ساز آسٹبلی کے لیے بورڈ کی سفارشات پر عمل درآمد کو لازم قرار دیا جانا چاہیے جبکہ اس کی حیثیت مشاورتی تھی۔ میں اس بارے میں کوئی بات حقی طور پر نہیں جانتا، سوائے اس کے کہ وہ غیر مطمئن تھے اور انہوں نے اسی بناء پر پیرس والپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی اپنے والد صاحب سے اس بارے میں کچھ پوچھا ہو یا انہوں نے خود اپنے طور پر مجھے کوئی خاص بات بتائی ہو۔ اپنے مزاج کے عین مطابق، ڈاکٹر حمید اللہ ان چیزوں کے بارے میں کوئی شور و ہنگامہ کیے بغیر یہاں سے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆ ☆☆☆ ☆☆☆

کراچی کے بعد ان سے میری اگلی ملاقات پیرس میں ہوئی اور ان ملاقاتوں کے درمیان چھ سال کا وقفہ ہے۔ ان کے بہت سے ماحول کی طرح ان کا پڑتال rue de Tournon, Paris VI نہ صرف میری نوٹ بک میں درج تھا بلکہ میرے ذہن پر بھی نقش تھا۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں اپنے ایک دوست محمد حسن صاحب کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں موڑیاں جا رہا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے پیرس میں رکنے کا فیصلہ کیا۔ میں بلا مبالغہ یہ عرض کرتا ہوں کہ یہاں رکنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اپنے عہد کی اس عظیم صاحب علم شخصیت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ ان دنوں الجزاں کی تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔ آج میرے لیے سامراجیت کے خلاف ان شدید احساسات کو ان کی پوری شدت کے ساتھ یاد کرنا آسان نہیں جو سینا تیس برس پہلے میرے اور دوسرے نوجوانوں کے دلوں میں موجود تھے۔ پاکستان میں فرانس کے بائیکاٹ کی مہم بھی اپنے عروج

پر تھی۔ پیرس کے ہوائی مسٹقر پر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم کسی ایسے ہوٹل میں قیام نہیں کریں گے جو کسی فرانسیسی کی ملکیت ہو۔ گویا ہم نے یہ طے کیا کہ ہم پیرس میں بھی فرانس کا باپنکاٹ کریں گے! جوانی کے جوش میں ہم نے ”میزبان پیرس“ سے کہا کہ ہم کسی الجزاڑی ہوٹل میں نہ ہبھنا چاہتے ہیں۔ (میزبان پیرس ایک دفتر ہے جو رہائش مسائل میں سایحوں کی معاونت کرتا ہے)۔ جب کاؤنٹر پر بیٹھی اٹوکی نے یہ کہا کہ وہ یہ نہیں جانتی کہ کون سا ہوٹل الجزاڑی ہے اور کون سا غیر الجزاڑی تو ہم نے سوچا کہ وہ یا تو ہم سے مذاق کر رہی ہے یا جھوٹ بول رہی ہے۔ بہر حال ہم نے پیرس کے سے ہوٹلوں کی فہرست پر نظر ڈالی اور ہوٹل ڈی گرینیڈ (Hotel de Grenade) کا انتخاب کیا۔ کم سے کم اس کے نام میں تو اسلامیت کی جھلک تھی!

ہوٹل جاتے ہوئے ہم ڈاکٹر حمید اللہ کے گھر کے قریب رکے۔ خوش قسمتی سے وہ اسی وقت اس قدیم عمارت میں داخل ہو رہے تھے جس کے ایک فلیٹ میں ان کی رہائش تھی۔ وہ اپنے مخصوص سادہ انداز میں فرنچ روٹی کا تھیلا اٹھائے ہوئے تھے۔ تازہ روٹی کی خوش بو ہماری بھوک کو تیز کر رہی تھی۔ اس وقت شام کے پانچ نجع رہے ہوں گے اور دن بھر کے کام کے بعد ڈاکٹر صاحب کسی قدر تھکے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے کشاور پیشانی اور بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم اس وقت اپنے ہوٹل جا رہے ہیں اور کچھ دیر تازہ دم ہونے کے بعد شام کا کچھ وقت ان کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔ ان کا چہرہ سمرت سے دمک اٹھا اور انہوں نے خوشی سے آمادگی ظاہر کر دی۔ جلد ہی ہم ہوٹل جا کر واپس آگئے اور کئی منزلوں کی سیر ہیاں چڑھ کر ان کے سادہ سے فلیٹ تک پہنچ گئے جسے ہمارے لیے پیرس میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ -4 rue de Tournon

ہم نے کچھ وقت ڈاکٹر حمید اللہ کے فلیٹ میں ادھر اُدھر کی گفتگو میں گزارا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں بتایا کہ فرانس میں اسلام ایک مناسب رفقار سے پہلی رہا ہے اور لوگوں کی ایک معقول تعداد اپنی روحانی تسلیم کے لیے اس کے دامن میں پناہ لے رہی ہے۔ ہماری تجویز پر ڈاکٹر صاحب ہمارے ساتھ ایک ریستوران تک آئے، جس کا نام شاید الگمرا تھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ ریستوران لیٹن کوارٹر میں تھا۔ ریستوران میں چونکہ حلال گوشت میسر نہیں تھا اس لیے ہم نے گوشت کے بغیر ہی گزارا کیا۔ جب ہم نے بل ادا کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب پہلے ہی یہ کام کر چکے ہیں۔ کچھ بات یہ ہے کہ یہ ہماری خواہش کے سراسر خلاف تھا اور ہمارے لیے قدرے باعث شرمندگی بھی۔ جن لوگوں کو ڈاکٹر صاحب سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ کشاور

دلی اور مہمان نوازی آن کے نمایاں ترین اوصاف تھے۔

کھانا ختم ہو گیا لیکن ہم کچھ دیر مزید ان کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔ الجزاڑی تحریک آزادی سے گہری دل چھپی کے باعث ہم ان کے ساتھ الجزاڑی مسلم شوڈش ایسوی اشن کے دفتر گئے۔ وہاں ہماری ملاقات جناب محمد خمسیتی مرحوم سے ہوئی جو اس تنظیم کے سیکرٹری جzel تھے۔ چند سال بعد جب الجزاڑی آزاد ہوا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم کتنے اہم لوگ تھے! جس آدمی نے بڑے حلم اور تواضع کے ساتھ ہم سے کم و بیش ایک گھنٹے گفتگو کی تھی وہ آزاد الجزاڑی کا پہلا وزیر خارجہ تھا۔

اگلے دن جمعہ تھا اور ہم ناشتے کے فراؤ بعد ڈاکٹر صاحب کے گھر جا پہنچے۔ گزشتہ شب جب ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کہا تو ڈاکٹر صاحب نے کمال عنایت سے یہ پیش کی تھی کہ نماز جمعہ کے لیے وہ ہمیں پیرس کی جامع مسجد اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ جب ہم ان کے ہاں پہنچے تو وہ ایک فرانسیسی خاتون کو اسلام کی تعلیم دے رہے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب نے ایک دینی بہن کہہ کر ہمیں ان خاتون سے متعارف کرایا تو ہمیں معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔

جب خاتون کا سبق ختم ہوا تو ڈاکٹر صاحب ہم سے مخاطب ہوئے۔ گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں گزشتہ رات کو ٹوٹا تھا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ گزشتہ ایام میں اسلام قبول کرنے والے لوگوں کی تعداد میں قبل ذکر اضافہ ہوا ہے اور عورتوں میں یہ رجحان قدرے زیادہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ فرانس کی بعض خواتین، جن میں ایک دو وہ بھی تھیں جن کو ملکہ حسن کا اعزاز حاصل ہو چکا تھا، کچھ ہی عرصہ قبل مشرف بہ اسلام ہوئی ہیں۔ گفتگو درمیان میں تھی کہ نماز جمعہ کا وقت قریب آگیا اور ہم پیرس جامع مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسجد تک جانے کے لیے زیر زمین ٹرین کا انتخاب کیا۔ میں اور محمد حسن صاحب پہلی مرتبہ زیر زمین ٹرین کا سفر کر رہے تھے، جس نے اس سفر کو ہمارے لئے مزید یادگار بنا دیا۔

جب ہم مسجد پہنچے تو وہ ہمیں بہت دل کش محسوس ہوئی۔ مسجد کا اندری طرز تعمیر اس کے ٹکوہ اور حسن میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہ تصور کہ ہم یورپ کے ایک نہایت مرکزی اور تاریخی اہمیت کے شہر میں جمعہ کی نماز ادا کر رہے ہیں ایک عجیب طرح کے روحانی کیف اور دلی مسرت کا باعث تھا۔

میں اس بات کا ذکر کر چکا ہوں کہ گزشتہ رات ہم الحمرا ریستوران میں ڈاکٹر صاحب کی میزبانی سے لطف اندوز ہو چکے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم نے ریستوران کے مالک سے ذیجہ گوشت کے

بارے میں پوچھا تھا تو اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے معدرت خواہانہ لجھ میں ریستوران کے کاروبار کو اس کا سبب قرار دیا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ گزشتہ پچیس برسوں میں ہم پہلے گاہک ہیں جنہوں نے ذبیحہ کا مطالبہ کیا تھا۔ اس نے ہمیں اگلے دن یعنی جمعہ کو دوپھر کے کھانے کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ وہ خاص طور پر مویشی فارم جائے گا اور ہمارے لیے ایک بھیڑ ذبح کروا کر لائے گا۔ جمعہ کی نماز کے بعد جب ہم ریستوران پہنچے تو ہمیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اس نے ہمارے لیے شمالی افریقہ کا ایک لذیذ کھانا تیار کر رکھا ہے۔ ہم نے کئی دنوں سے گوشت نہیں کھایا تھا، اس لیے اس روز ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا اور کھانے کے ساتھ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی صحبت سے بھی پوری طرح مستفید ہوئے۔

اسی روز شام کے وقت ہم ڈاکٹر حمید اللہ کو خدا حافظ اور پیرس کو الوداع کہہ رہے تھے۔ اس وقت ہمیں اس بات کا ذرہ برابر افسوس نہ تھا کہ ہم نے اس غیر معمولی حسین شہر کے تاریخی اور دوسرے اہم مقامات کی تقریباً مطلق سیر نہیں کی تھی۔ اس ملاقات کی یادوں نے عرصے تک ہمیں مسحور کیے رکھا۔ ہم اس بات پر بے حد خوش تھے کہ اگرچہ سیر پاٹا تو نہ ہو سکا لیکن ایک نادر اور لیگانہ روز شخصیت کے ساتھ ہم نے کافی وقت قرب و بے تکلفی کی نفعا میں گزارا۔

☆☆☆ ☆☆☆ ☆☆☆

ڈاکٹر حمید اللہ سے چند یادگار ملاقاتیں ۱۹۷۳ء میں ظہران اور لغیر میں ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب سعودی حکومت کی دعوت پر سعودی عرب تشریف لائے تھے۔ میں ان دنوں ظہران میں ایک یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا، جو آج کل ”سکنگ فہد یونیورسٹی آف پرولیم اینڈ منرزا“ کہلاتی ہے۔ اس سفر میں ڈاکٹر صاحب نے ہماری یونیورسٹی سمیت کئی تعلیمی اداروں میں پیچھہ دیئے۔ مجھے یہ جان کر حیرت بھی ہوئی اور مسیرت بھی کہ ۶۶ برس کی عمر میں بھی وہ جزیرہ نماۓ عرب کے بارے میں اپنی فیلڈ ریسرچ میں حسب سابق مشغول تھے اور ان میں اب بھی وہی گرم جوشی اور توانائی موجود تھی، جس کا مظاہرہ انہوں نے تیس سال کی عمر میں کیا تھا۔ ان کی نوجوانی کی عمر میں اس محنت شاقہ کا شرہ ”رسول اکرم کے میدان جنگ“ نامی کتاب ہے۔

ایک جمعرات کی صحیح قطیف کے سفر میں جو لوگ ان کے ساتھ تھے ان میں ایک میں بھی تھا۔ قطیف نامی شہر کا میسٹر اپنے دفتر میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ روائی سے قبل ڈاکٹر صاحب نے اپنے سفر کے مقاصد کے بارے میں ہم سب سے اچھی خاصی گفتگو فرمائی تھی۔ قطیف کے اس سفر کا اصل

مقصد ایک چھوٹی بستی زارہ کا دورہ تھا جو قطیف سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ (یہ ایک دوسرے اور نسبتاً زیادہ مشہور گاؤں عوامیہ سے تقریباً ملتے ہے)۔ ڈاکٹر حمید اللہ اپنی برس رزیں تحقیق کے لیے علمی طور پر پوری طرح تیار ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اپنی بعثت سے پہلے جب حضور رسالت مآب ﷺ تجارت میں معروف تھے تو آپ نے جزیرہ العرب کے مشرقی حصہ بالخصوص اس کے ساحلی علاقوں کے تجارتی سفر کیے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ اور تحقیق کی رو سے چھٹی اور ساتویں صدی میں یہاں تجارتی میلے کثرت سے منعقد ہوتے تھے۔ ان میلوں کا زمانہ کچھ اس طرح مقرر کیا گیا تھا کہ بغیر کسی قابل ذکر انقطاع کے یہ وقفہ وقفہ سے کم دش سال بھر منعقد ہوتے رہتے تھے۔ ان امور پر انہوں نے ۱۹۷۳ء میں جو کچھ فرمایا تھا، اس کا بڑا حصہ میری یادداشت میں آج بھی تازہ ہے اور میں اس کا بڑا حصہ بھول ان حوالہ جات کے، جو انہوں نے اہم کتب سے دیئے تھے، سنا سکتا ہوں۔ (اس سے ان کی تدریسی صلاحیتوں کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے)۔ اس موقع پر انہوں نے اس روایت کا خاص طور پر ذکر فرمایا تھا جس میں رسالت مآب ﷺ نے زارہ کے چشمہ کے پاس اپنے قیام کا ذکر فرمایا ہے۔ (حوالے کے لیے دیکھئے، مند احمد بن حبل، حدیث نمبر ۱۹۹۱ء، مطبوعہ دار احیاء التراث العربیہ، ۱۹۹۱ء)۔ اس خطے کے جغرافیہ اور تاریخ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کو بے شمار تفصیلات از بر تھیں۔

میر کے دفتر میں چند منٹ میں نقشوں کی مدد سے زارہ کو شناخت کر لیا گیا، بلکہ اس موقع پر وہاں کئی ایسے مقامی لوگ موجود تھے جنہیں زارہ تک جانے کے لیے کسی نقشے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چند لمحوں کے بعد ہم قطیف کے میر کے ساتھ اس چشمے پر کھڑے تھے جہاں چودہ سو سال پہلے رسول اکرم ﷺ کے قدم مبارک پڑے تھے۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا جو دل کے نہاں خانے میں ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ چشمے کے پاس ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی، جسے عثمانی ترکوں نے تعمیر کیا تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ تاریخی اہمیت کے حال دیگر مقامات پر بھی تشریف لے گئے جن کے بارے میں وہ پہلے ہی سے وسیع معلومات رکھتے تھے۔ یونیورسٹی میں اپنی تدریسی مصروفیات کے باعث میں دوسرے مقامات کے سفر میں ان کے ساتھ نہ جا سکا اگرچہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں ایسے ہر سفر میں ان کا ہم سفر ہوتا۔ یہ میرے لیے عزت کی بات ہوتی اور میں اس طرح بہت کچھ سیکھتا۔ میں ڈاکٹر حمید اللہ کے تاجر علمی، اُن کی تاریخی اور جغرافیائی معلومات سے ناواقف نہ تھا۔ تاہم ان کی معلومات کی گہرائی اور وسعت میرے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب میں جو چیز بہت نمایاں تھی وہ رسالت مآب ﷺ کی ذات مبارک سے ان کی والہانہ محبت تھی۔ اگرچہ ان کی

محبت میں کسی تیز رو دریا کے شور کی جگہ سمندر کا پروقار سکوت تھا۔ یہ اللہ کے رسول کے ساتھ ان کی وہ عقیدت تھی جو انہیں عمر کے بڑے حصے میں وادی وادی قریبہ قریبہ اور کوبکو لیے پھرتی رہی۔

☆☆☆ ☆☆☆ ☆☆☆

اس ملاقات سے گیارہ برس بعد ۱۹۸۵ء میں مجھے اپنے ایک عزیز دوست اسماعیل ابراہیم نواب کے ساتھ یونیسکو کی ایک میٹنگ کے سلسلے میں پیرس جانے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے علم و فضل اور تقویٰ کے باعث، ہم دونوں ہی ان کے یکساں عقیدت مند ہیں۔ ہم دونوں کا یہ خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا خصوصی سایہ تھا۔ ایک سہ پھر ہم دونوں ان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اس ملاقات کا میں اپنے مضمون کے آغاز میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس موقع پر ہم نے کم و بیش ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا اور مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو کی۔

اس یادگار ملاقات میں، میرے دوست اسماعیل نواب نے ڈاکٹر صاحب کے سفر جاز کا ذکر کیا، جب وہ کافی کم عمری میں بیت اللہ کے سائیے میں اس جلیل القدر شخصیت سے ملے تھے۔ یہ چالیسویں دھائی کے آخری سالوں کی بات تھی۔ اسماعیل نواب نے یاد دلایا کہ وہ اس وقت بھی مختلف زبانوں پر ان کی درس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اس موقع پر حیدر آباد دکن کے ایک قافلہ ج کے ساتھ بطور امیر قافلہ جاز تشریف لے گئے تھے۔ بیت اللہ کی اس ملاقات میں اسماعیل نواب نے ان سے دو موضوعات پر خاص طور گفتگو کی تھی، جو ان دونوں ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی کام کا خصوصی موضوع تھے، یعنی قرآن مجید کے مختلف زبانوں میں ترجمے اور مدینہ منورہ کے تاریخی مقامات، بالخصوص نبی ﷺ کے میدان ہائے جنگ۔

پیرس کی اسی ملاقات میں میں نے ان سے حکومت پاکستان کے ایوارڈ کے بارے میں دریافت کیا جو چند ہفتے قبل ہی ان کو ملا تھا۔ اس پر انہوں نے جو جواب دیا اس کا تذکرہ میں ابتدا میں کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ جواب واقعہ یہ ہے کہ ہم کو مبہوت کر دیئے والا تھا۔ سادہ سے الفاظ میں کبھی گئی یہ بات، شدت اخلاص کا مظہر تھی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ یہ الفاظ ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے۔

اگر ہم ڈاکٹر حیدر اللہ کی زندگی پر ایک نظر ڈالیں اور اس کو سمجھنا چاہیں تو اس کی کنجی ڈاکٹر صاحب کا یہ اہم جملہ ہے: ”اگر میں یہاں لے لیتا تو پھر وہاں کیا ملتا؟“

ڈاکٹر صاحب کے پورے علمی کام کو کھنگال جائیے، لیکن شاید اپنی جلالت شان کے باوجود اس میں ہمیں ان کی اصل شخصیت کا راز نہ مل سکے۔ نہ ان کے فرانسیسی ترجمہ قرآن میں، جس کے دسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ نہ سیرت رسول پر ان کی گراں قدر نگارشات میں، جس کا اعلیٰ ترین نمونہ ان کی فرانسیسی تصنیف *le prophet de l'islam* ہے، نہ ان کے غیر معمولی اور تاریخی علمی کام میں (جیسے البلادزی کی انساب الاضراف، جسے انہوں نے مدون کیا یا الوہاق السیاسیۃ، جو عہد رسالت اور دور خلافت راشدہ کے سیاسی دستاویزات کا ایک عظیم الشان مجموعہ ہے اور جس پر انہوں نے اپنی بے پناہ توائی صرف کی تھی)۔ اسی طرح یہ راز ہمیں اسلامی مین الاقوامی قانون پر ان کی عہد ساز تصنیف *The Muslim Conduct of State* میں بھی نہیں ملے گا۔ یہ راز اگر بند ہے تو اس جملے میں جو اس ملاقات میں انہوں نے کہا تھا اور جو ان کی شخصیت ان کے محیر العقول کام اور اس کی برکت کا اصل عنوان ہے۔ اب ہم بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے ترجمہ قرآن کو غیر معمولی پذیرائی کیوں حاصل ہوئی، ان کی کتب سیرت کیوں اس درجہ مقبول ہوئیں، اور یہ کیسے ہوا کہ ان کا وجود بے شمار انسانوں کے لیے، جن میں مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم بھی، میnarہ نور بن گیا۔ اس تاریخی جملے کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ ہمارے لیے کوئی محمد نہ رہے تھے!
